

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اشارات

جماعت اسلامی کی بھالی کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کے امیر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور دیگر زعماء کی ربائی کے بالکل غیب سے سامان پیدا کر کے اپنی خاص رحمت اور تائید کا ثبوت فرمایا کیا ہے۔ ہمارے پاس وہ الفاظ نہیں جن کے ذریعہ ہم اپنے دلی احساسات کا اظہار کر سکیں۔ ہم اُس مالک الملک کے حضور میں دعا گو ہیں کہ وہ ہمیں ہمیشہ حق و صداقت کے راستے پر گامزن رکھے اور آخرت میں ہماری ساری کوتاہیوں اور لغزشوں سے صرف نظر کرتے ہوئے ہمیں یومِ حشر کی ذلت و خواری سے بچائے اور ان لوگوں کے زمرے میں شامل کرے جو اُس کی نظرِ کریم کے مستحق ہیں۔

جماعت اسلامی اور اُس کے قائد کے ساتھ جو ناروا سلوک ہوا ہے وہ اگرچہ ایک دلخراش داستان ہے اور برہمراقتدار طبقے کی غیر حقیقت پسندانہ بلکہ عقلمانہ ذہنیت کی پوری طرح غمازی کرتا ہے لیکن اس کے باوجود مستقبل کے بارے میں مایوس ہونے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ اس ملک کے سیاسی افاق پر بلاشبہ بڑی تیزی کے ساتھ تیرگی پھیل رہی ہے مگر اس تاریک فضا میں روشنی کے بہت سے مینار موجود ہیں جو بڑی پامردی کے ساتھ تاریکیوں کی فراخمت کر رہے ہیں اور ان کے غلبے کی ہر کوشش کو ناکام بنا رہے ہیں۔

نور کے ان مختلف میناروں کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سب سے

زیادہ مضبوط۔ سب سے زیادہ درخشاں اور سب سے زیادہ تابناک مینار خود دینِ حق ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جس وقت اس نور نے اس نیم براعظم میں اپنی حیات آفریں کرنیں پھیلانی شروع کیں اس وقت اُس میں وہ تابناکی باقی نہ رہی تھی جو ہمیں حضور سرورِ کائنات اور آپ کے جلیل القدر رفقاء کے مبارک دَور میں نظر آتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس نے اس ملک کی پوری فضا کو منور کر دیا۔ اس شمع کے روشن ہوتے ہی یہاں کے ظلمتکدروں میں ایک پھل سی چم گئی۔ انسان کے فکر و نظر پر ننگِ نظری، تعصب اور جہالت کے جو پردے صدیوں سے پڑے ہوئے تھے اس نے انہیں چاک کیا۔ یہاں کے لوگ اسی کی بدولت زندگی اور اس کے حقیقی مسائل پر آزادانہ غور کرنے کے قابل ہوئے۔ اُن کی نظر میں وسعت، نگر میں بلندی اور نقطہ نگاہ میں حقیقت پسندی پیدا ہوئی۔ اسلام کی آمد کے بعد اہل ہند کے افکار و نظریات اور اُن کے معاشرتی ڈھانچوں میں جو عظیم تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ سب اسی نور کی رہیں منست ہیں۔

اسے مسلمانوں کی اپنی کوتاہی اور بد نصیبی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس ملک میں سات سو سال حکمران رہنے کے باوجود اس کے سارے باشندوں کے قلوب و دماغ پر اسلامی تعلیمات کے نقوش پوری طرح منسجم نہ کر سکے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اسلام میں دلوں کو مسح کرنے کی قوت نہ تھی، بلکہ اس ناکامی کا بڑا سبب خود مسلمانوں کا طرزِ عمل تھا۔ وہ جس دین کے علمبردار ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اُن کی زندگیاں اُن کے اس دعویٰ کی پوری طرح تائید نہ کرتی تھیں۔ اُن کی سیاسی اور معاشرتی سرگرمیوں میں جاہلیت کی بہت سی جھلکیاں نظر آتی تھیں۔ جب کسی دین کے علمبردار ہی اُس کے معاملے میں کیسوں نہ ہوں تو اُس دین کے متعلق دوسرے لوگوں کا اندازِ فکر بڑی حد تک بدل جاتا ہے۔ وہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ اگر یہ نظریہ حیات سراپا خیر ہی ہے تو آخر اس کی محبت اور پیروی کا دم بھرنے والے اسے پوری طرح کیوں نہیں اپناتے۔ اس طرزِ استدلال میں خواہ کتنا ہی منطقی مقم ہو لیکن لوگ بالعموم اسی بیج پر سوچتے ہیں

اسلام کو دین حق تسلیم کرنے کے باوجود اُس سے نیم دلانہ و استیگی نے اگرچہ ہمارے لیے بہت سی پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں، اور خصوصاً مسلمان بادشاہوں اور امراء کے طرز عمل سے ہماری تاریخ کا رخ کسی دوسری سمت مڑ گیا ہے، لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ پاک ہند کے مسلمانوں کی زندگی صرف اسی دین کے دامن میں پناہ لینے کی وجہ سے محفوظ رہی ہے۔ اس کی مقناطیسی قوت نے ہماری ملت کے مائل بہ انتشار اجزاء کو باہم مربوط رکھا، اس کے معاشرتی نظام نے اسے دوسری اقوام سے الگ اور ممتاز کر کے اُسے ایک مستقل ملی وجود عطا کیا، پھر اسی سے مسلمانوں نے ہر گام پر زندگی کی حرارت حاصل کی۔ آپ اس بزرگ عظیم میں اگر مسلم قوم کی زندگی کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اسلام ہی وہ واحد سہارا تھا جس سے اس کا چراغ مخالفتوں اور مخالفتوں کے طوفانوں میں گھر کر بھی مسلسل جلتا رہا۔ پھر یہ معاملہ صرف اُس کی بقا تک ہی محدود نہیں۔ اس کے اندر ترقی کرنے اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو واپس لانے کے لیے جتنی تحریکات اٹھیں اُن کی تہ میں ہمیشہ ایک چھتتا ہوا احساس موجود رہا ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی کا ڈھانچہ اُس نقشے کے مطابق مرتب نہیں ہوا جو ہمیں حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا۔ یہ چھتتا ہوا احساس ہماری زندگی کی سب سے قیمتی مناع ہے جس نے ہمیں اسلام سے کم کسی چیز پر راضی نہیں ہونے دیا۔ اکبر کے خلاف مجدد الف ثانی کی جدوجہد، اور کفر کی بڑھتی ہوئی یلغار کے مقابلے میں حضرت سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کا جہاد سب اسی مقدس احساس کے مختلف مظاہر ہیں۔

ممکن ہے بعض حضرات اس جذبہ کی غیر معمولی قدر و قیمت سے پوری طرح واقف نہ ہوں۔ لیکن انہیں اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ قوموں کی زندگی میں اس قسم کے احساسات جذبہات بہت بڑی اہمیت رکھتے ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اقوام کی زندگی انہی احساسات سے وابستہ ہے تو یہ بات زیادہ صحیح ہوگی۔ سوچیں کہ آخر وہ کونسا جذبہ تھا جس نے ہمیں ہندو

قوم کے اندر رُندِ غم ہونے سے بچاتے رکھا؛ وہ کونسا احساسِ زیاں تھا جس سے بے تاب ہو کر ہم نے وقت کے جباروں اور قہاروں کے خلاف ٹکرتی اور اس کے نتیجے میں جان و مال اور عزت و آبرو تک ٹٹا ڈالی۔ اگر اسلام کی عظمت کا نقش ہمارے دلوں پر ثبت نہ ہوتا اور اس کی محبت تمام دوسرے رشتوں پر غالب نہ ہوتی تو آج ہمارا بھی حشر انہیں اقوام کا سا ہوتا جنہوں نے اپنے نصب العین کو بھلا کر خود فراموشی جیسے جُرم کا ارتکاب کیا ہے۔

قوموں کی زندگی روایات سے عبارت ہوتی ہے، نصب العین کی محبت اُن کے اندر اگے بڑھنے کی تڑپ اور اپنی قوموں کو ایک راہ پر لگانے کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ اور مقصد کا عشق راستے کی ساری فراحتوں اور دشواریوں کو مٹا کر رکھ دیتا ہے۔ جو قوم اپنے سامنے کوئی واضح نصب العین نہیں رکھتی وہ قوم نہیں بلکہ راگھ کا ایک ڈھیر ہے جسے ہوا کے تھپیڑے جس طرف چاہتے ہیں اڑا کر لے جاتے ہیں۔

تھوڑی دیر کے لیے ماضی کو نظر انداز کر کے ذرا قیامِ پاکستان کے بعد کے واقعات پر نگاہ ڈالیے اور دیکھیے کہ اس دین نے ہمیں کس قسم کے خطرات سے بچایا ہے۔

پاک تانی قوم جن عناصر پر مشتمل ہے اُن کے درمیان سوائے اسلام کے اور کوئی چیز بھی مشترک نہیں۔ ہمارے ملک میں نہ جغرافیائی وحدت موجود ہے نہ لسانی وحدت۔ ہمارے ہاں رنگ و نسل کا بھی کوئی اشتراک نظر نہیں آتا۔ اسلامی روایات کے سوا کوئی ایسی روایت بھی ہمارے پاس نہیں جن سے وابستگی ہمارے اندر احساسِ یکائیت پیدا کرے۔ ہر طرح کے شمار اختلافات کے باوجود ہم محض اللہ کے فضل سے ایک متحد اور باہم مربوط قوم ہیں، کیونکہ اسلام کے مضبوط رشتے نے ہماری ملت کے مختلف عناصر کو ایک دوسرے سے جوڑ رکھا ہے

اس ملک پر گزشتہ چند سالوں میں جس قسم کے مصائب نازل ہوئے ہیں اور حکمران

طبقتوں نے مختلف اوقات میں اس کے جذبات کو جس بے دردی کے ساتھ کچلا ہے انہیں یہ قوم محض اسلام کی محبت کی وجہ سے برداشت کرتی رہی اور مضحمل اور مایوس ہونے کی بجائے نہایت حوصلہ شکن حالات میں بھی دین کے خلاف ہر قسم کے حربوں اور سازشوں کو ناکام بنانے کے لیے پوری جرات کے ساتھ جدوجہد کرتی رہی۔

اسلام مسلم قوم کی قوت کا واحد سرچشمہ ہے۔ اُس کی تابندہ روایات اس کی زندگی کے ہر گوشے میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔ اس کی رگ رگ میں اسلام کے اثرات اس طرح گہرے اُتے ہوئے ہیں کہ کوئی طاقت انہیں کھڑچ کر نہیں نکال سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جو گروہ بھی اس تاریخی قوت کو نظر انداز کر کے کوئی قدم اٹھاتا ہے وہ ناکام ہو جاتا ہے اور آئندہ بھی جو ایسا کرے گا وہ لازماً ناکام ہو کر رہے گا۔ اس قوت کا اندازہ کرنے کے لیے عقل کی کوئی زیادہ مقدار درکار نہیں صرف یہ دیکھیے وہ حضرات جنہیں اس ملک میں بلا شرکتِ غیرے کئی سال تک اقتدار حاصل رہا اور جنہوں نے اپنی قوت و طاقت کے زعم میں اسلامی شریعت کے اندر اصلاح کے بعض ایسے "انقلابی کارنامے" انجام دیتے جن کی جرأت انگریز بھی نہ کر سکتا تھا، وہ بھی آج عوام کے سامنے اپنے آپ کو نادم پاتے ہیں اور انہیں بار بار اس امر کا یقین دلا رہے ہیں کہ وہ اپنی ان انقلابی "اصلاحات" کو واپس لینے پر آمادہ ہیں۔ ان لوگوں کے وعدوں میں کس حد تک صداقت ہے اس سے ہمیں اس وقت کوئی بحث نہیں۔ اس کا فیصلہ تو بطنِ مستقبل میں پنہاں ہے یہاں ہمیں صرف اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ خوش قسمتی سے ہمارے پاس اسلام کی شکل میں ایک ایسا نصب العین موجود ہے جس کی روشنی میں ہم بھلے اور بُرے کے درمیان تمیز کر سکتے ہیں، اپنی منزل کے خطوط متعین کر سکتے ہیں اور اپنے افعال و اعمال اور حسن کارکردگی کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اگر ہماری رہنمائی کے لیے اسلام کا نور نہ ہوتا تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ہم ضلالت کی کن خطرناک اور تاریک وادیوں میں بٹھکتے پھرتے۔

اسلام کے بعد دوسری چیز جس کی ہمیں دل و جان سے قدر کرنی چاہیے اور جس کے خلاف ہر قسم کی کوشش کو ناکام بنانے کے لیے ہمیں سر دھڑکی بازی لگانے سے بھی گریز نہ کرنا چاہیے وہ جمہوریت ہے۔ یہ انسان کی بڑی خوش بختی ہے کہ اُس نے صدیوں کے ناقابلِ بیان مصائب اٹھا کر اور جان و مال کی بے شمار قربانیاں دے کر راتے عام کو برسرِ اقتدار لانے کے لیے ایک پُر امن راستہ دریافت کیا ہے۔

فکر و عمل کے اس عظیم انقلاب کے پیچھے صرف ایک احساس ہی کار فرما ہے کہ انسان کو بحیثیت انسان اُس کے خالق و مالک نے جو شرف عطا کیا ہے وہ اُسے حاصل ہو، اور اس شرف کی بنا پر اُسے جو حقوق فطرت کی طرف سے ملے ہیں اُن سے کوئی شخص یا ادارہ اس کو محروم نہ کر سکے۔

آپ اگر تاریخ پر ایک سرسری نگاہ ڈالیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ انسانیت کے مختلف طبقات کے درمیان جو کشمکش اول روز ہی سے چلی آ رہی ہے اُس کی تہ میں ان حقوق کی حفاظت اور پاسبانی کا جذبہ کار فرما رہا ہے۔ اہل غرض، خواہ کسی مرتبہ اور مقام پر ہوں انسان کے ان بنیادی حقوق پر ڈاکہ ڈالتے رہے اور دوسری طرف انسان نے سب سے زیادہ زحمت انہی کی حفاظت کے لیے اٹھائی۔ اس کشمکش کے مظاہر ٹوٹی تو ہمیں مذہب، تجارت، معیشت اور معاشرت، غرض زندگی کے سارے شعبوں میں دکھائی دیتے ہیں لیکن اس کا سب سے بڑا میدان سیاست رہا ہے۔ کسی ملک کے اندر چند مقدس مستثنیات کو چھوڑ کر جب کوئی فرد یا طبقہ اقتدار کے تخت پر متمکن ہوا تو اُسے سب سے زیادہ اس بات کی فکر دامنگیر ہوئی کہ جس بلند و بالا منصب کو اُس نے حاصل کر لیا ہے، وہ کسی نہ کسی طرح اُسے ہمیشہ کے لیے اپنے حق میں محفوظ کر لے اور دوسروں پر اس کے دروازے قطعی بند کر دے۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے اُس نے انسانوں کو شرفِ انسانیت سے محروم کرنا ضروری سمجھا تا کہ وہ بھیڑ بکریوں کا ایک گتہ بن جائیں جنہیں اقتدار کی لاٹھی اپنی منشا اور مرضی کے مطابق جس طرف چاہے ہانک کر لے جائے اور اُن کے

دل اپنی اس بے بسی پر نہ تو مضطرب اور پریشان ہوں اور نہ ہی اس ظالمانہ روش کے خلاف ان کے اندر کوئی تحریک پیدا ہو۔

دوسری طرف نوع بشری نے بحیثیت مجموعی جس چیز کے تحفظ کے لیے سب سے زیادہ قربانی دی ہے وہ یہی شرف انسانیت اور اپنے بنیادی حقوق کا تحفظ ہے۔ وہ بچاوری بسا اوقات حالات کے ہاتھوں بے زبان جانوروں کی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئی، لیکن اُس کی فطرت اس ذلت کے خلاف ہمیشہ بغاوت کرتی رہی اور اُسے اس بات پر بھارتی رہی کہ وہ اس سبت اور ذلیل مقام کو قبول کرنے پر کبھی آمادہ نہ ہو۔

اس کشمکش کی صورتیں حالات کے مطابق بدلتی رہی ہیں۔ تاہم تحفظ حقوق کی جدوجہد کسی نہ کسی شکل میں ہمیشہ جاری رہی، یہاں تک کہ انسان نے صدیوں کی محنت اور قربانی کے بعد اپنے حقوق کو حکمران طاقتوں سے پوری طرح تسلیم کر دیا اور انہیں اس حقیقت کے ماننے پر مجبور کر دیا کہ انسان کی حیثیت سے حاکم و محکوم سب برابر ہیں، اُن کے فطری حقوق پر کوئی شخص یا طبقہ دست درازی کرنے کا مجاز نہیں اور اُن کی رائے ہی ملک کے انتظام و انصرام میں بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔

ان امور کے طے ہو جانے کے بعد پھر یہ سوال حل طلب تھا کہ راستے عامہ کو ملک اور قوم کے اندر موثر قوت بنانے اور اُس کی بالادستی قائم کرنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اس معاملہ کو بھی بڑی مصیبت اور بڑی جانفشانی سے طے کیا گیا۔ راستے عامہ کو غالب آنے کے لیے بے شمار زحمتوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور ہر موقع پر نہ صرف جان و مال کا غیر معمولی زیاں ہوتا بلکہ ملک کا امن و امان تباہ ہو کر رہ جاتا تھا۔ اس مقصد کا حصول چونکہ آرام اور سکون کے ساتھ امن پسندانہ فضا میں ممکن نہ تھا اس لیے لوگ مشتعل ہو کر راستے عامہ کی حکمرانی قائم کرنے کے لیے آگے بڑھتے۔ دوسری طرف برسرِ اقتدار طبقے پوری

شدت کے ساتھ ان کے راستے میں مزاحم ہوتے اور جبر و استبداد کے سارے تھکنڈے استعمال کئے ان کی راہ روکتے۔ اس کا اثر یہ ہوتا کہ تبدیلی کے یہ جذبات کسی تعمیری مقصد میں صرف ہونے کے بجائے چڑ اور ضد سے بہک کر تخریب کی راہ پر بہ نکلتے۔ جس سے ملک کی پوری فضا شعلہ جوالہ بن جاتی اور اس کے اثرات انقلاب کے بعد مدتوں قائم رہتے۔

کسی قوم کے لیے اس سے زیادہ تکلیف دہ اور کوئی عذاب نہیں ہو سکتا کہ اس کے اندر اپنے حقوق کا پوری طرح شعور موجود ہو اور معاشرے میں ان کی بنیادی اہمیت کو پوری طرح تسلیم بھی کر لیا جائے لیکن جن لوگوں پر ان حقوق کی حفاظت کا فرض عائد ہوتا ہو وہ انہیں ہر وقت غصب کرنے کے درپے رہیں اور قدم قدم پر قوم کو ان کے تحفظ کے لیے حکمرانوں سے دست و گریباں ہونا پڑے۔ اس قسم کے غمگینانہ رویہ روح فرسا حالات میں افراد یا جماعتیں اپنی صلاحیتوں کو تعمیری کاموں میں آخر کس طرح لگا سکتی ہیں۔ تعمیری کام پُرمان اور سازگار ماحول کا طالب ہے، ایسا ماحول جو ہر قسم کی بیکار کشاکش سے یکسر پاک ہو اور جس میں مختلف طبقوں کے درمیان منافرت اور حقارت کے جذبات کے بجائے تعاون کا جذبہ کلہاڑا ہو۔ جس معاشرے کی ساری قوتیں بار بار شرف انسانی تسلیم کر دینے اور انسانی حقوق کو منوانے میں صرف ہوتی رہیں، اُس میں لوگوں کی تعمیری صلاحیتیں کس طرح پروان چڑھ سکتی ہیں۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں ہر وقت سر بھپول رہے، جہاں انسانیت کے دشمن انسانی شرف کے درپے آزار رہیں۔

جہاں ڈر اور خوف کے بل بوتے پر اجتماعی نظم قائم ہو اور جہاں لوگوں کو اپنے بنیادی حقوق کے بارے میں بھی کوئی یقین اور اطمینان نہ ہو وہاں کسی تعمیر کا خیال پریشان خیالی سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

یہ اپنی تلخ حقائق کے احساس کا نتیجہ تھا کہ انسانوں نے اگر ایک طرف انسانی شرف کے

تلفظ کے لیے پیہم اور مسلسل جدوجہد کی تو دوسری طرف انہوں نے رائے عامہ کو پرامن طریقے سے غالب لانے کے لیے دستوری اور آئینی جدوجہد کا ایک ایسا راستہ تلاش کیا جس کے ذریعہ بڑے امن کے ساتھ، کوئی خون بہائے بغیر، حکومت میں قوم کی خواہش اور مرضی کے مطابق تبدیلی لائی جاسکے۔ یہ انسانیت کی انسان دشمن طاقتوں پر ایک عظیم فتح تھی جس سے پوری آدمیت کو بہت بڑا فائدہ حاصل ہوا۔ چنانچہ آج اس امر کا فیصلہ کہ اقتدار کے تخت پر کون لوگ متمکن ہوں، قاضی شمشیر کی بجائے رائے عامہ کی عدالت سے طلب کیا جاتا ہے اور اس کا دیا ہوا فیصلہ بڑی آسانی کے ساتھ نافذ ہو جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قوم کی جو قوت رائے عامہ کو غالب کرنے میں صرف ہوتی تھی اُسے اب دوسرے تعمیری کاموں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

یہ انسانیت کا ایک ایسا قابلِ قدر تجربہ ہے جس سے ہمیں پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ خوش قسمتی سے ہم اس تجربہ سے نہ صرف پوری طرح آشنا ہیں بلکہ اس کی خوبیوں کو اچھی طرح جانتے ہیں اور اس کے عملی پہلوؤں سے بھی پوری پوری واقفیت رکھتے ہیں۔ پھر ہمیں ان بد نصیب ممالک کا حشر بھی معلوم ہے جہاں حکومت میں تبدیلی دوڑ کے بجائے شمشیر کے ذریعہ لائی جاتی ہے۔ دوسرے ممالک کو تو فی الحال نظر انداز کیجیے۔ خود مسلم ممالک کی تشویشناک صورت حال کو دیکھیے کہ وہاں کے عوام کو حکمرانوں اور بربر اقتدار طبقوں کی تبدیلی کے لیے ہر قدم پر آگ اور خون کے کس خوفناک سمندر میں سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ انقلاب کی جب کوئی ہلکی سی لہر بھی اٹھتی ہے تو وہ ان بد نصیب ممالک کے لیے کسی روشن مستقبل کا پیغام لانے کے بجائے بربادی کا پیغام لاتی ہے۔ تغیر کی معمولی جنبش کے ساتھ ہی دیوارِ استبداد بالکل بدست ہو کر حرکت میں آ جاتا ہے اور ایسے گھناؤنے جرائم کا ارتکاب کرتا ہے کہ جن سے درندوں کی گردنیں بھی ندامت سے جھک جائیں۔ پھر اس جبر کا رد عمل

شروع ہوتا ہے اور انتقام کی آگ کچھ مدت اندر ہی اندر سلگ کر اچانک بھڑک اٹھتی ہے اور ایک ملک کی پوری انسانی آبادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ جن باشندوں پر ہمیشہ ڈراؤ خوف مسلط رہے، جن کے جذبات ہمیشہ متلاطم رہیں اور جن کے ذہنوں میں بجز انتقام کے اور کوئی چیز موجود نہ ہو ان کی حالت زار کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے۔

ہم اپنے پاکستان کے حکمرانوں اور یہاں کے عوام سے بڑی دردمندی کے ساتھ یہ عرض کرتے ہیں کہ وہ براہ کرم کوئی ایسی حرکت نہ کریں جس سے یہ ملک بھی آمریت کی راہ پر چل نکلے اور اقتدار کی تبدیلی ہمارے لیے بھی وہی مصائب پیدا کر دے جو آج دوسرے مسلم ممالک کو درپیش ہیں۔

اس ضروری اصلاح کی ذمہ داری سب سے پہلے حکمرانوں پر عائد ہوتی ہے۔ انہیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ملک ان کی کوئی میراث نہیں بلکہ اس کی سربراہی کا منصب ان کے پاس محض ایک امانت ہے۔ ان کی حیثیت مالک کی نہیں بلکہ امین کی ہے۔ قوم جب تک اپنی آزاد مرضی سے ان پر اعتماد کرے اسی وقت تک انہیں اقتدار کے تخت پر متمکن رہنے کا پورا پورا حق ہے۔ مگر جس وقت قوم ان پر اپنا اعتماد دکھوٹھے اور وہ ان کی جگہ کسی دوسرے گروہ کو یہ امانت سونپنا چاہے تو برسرِ اقتدار طبقے کو اس راہ میں قطعاً حائل نہ ہونا چاہیے بلکہ بڑی خوشی کے ساتھ راتے عامہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا چاہیے۔ تختِ اقتدار پر متمکن حضرات کو اس بات کا پورا اختیار ہے کہ وہ اپنے کارناموں سے عوام کو آشنا کریں، اپنی خدمات کی قدر و قیمت سے انہیں آگاہ کریں اور اس طرح انہیں اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ اپنی مرضی سے ملک کی زمام کار ان کے ہاتھ میں سپرد کر دیں۔ لیکن انہیں اس بات کا کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ تنقید کی آواز کو دبا لیں، یک طرفہ پروپیگنڈے سے عوام کو دھوکہ دیں، صحیح حالات پر پردہ ڈالیں، غلط باتیں زبردستی باور کرائیں اور ناجائز نڈاہر سے راتے عامہ کے غالب آنے میں مزاحم ہوں۔ اس معاملے میں معمولی سی

لفزش اور کوتاہی بھی ملک و ملت کا ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے کیونکہ اس قسم کے حربے عوام کو ایسا اوقات نہایت خطرناک راہوں پر ڈال دیتے ہیں۔ برسرِ اقتدار طبقے اگر ملک کے حقیقی بھی خواہ اور اُس کی ترقی اور خوشحالی کے دل و جان سے آرزو مند ہیں تو انہیں تحتِ اقتدار سے چھٹے رہنے کے بجائے عوام کو اس بات کے پورے مواقع فراہم کرنے چاہئیں کہ وہ اپنی منشا کے مطابق جس گروہ کو چاہیں اختیارات کی باگیں سونپ دیں تاکہ یہ تبدیلی بغیر کسی ادنیٰ مزاحمت کے عمل میں لائی جاسکے۔

اس کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ انتخابات ہمیشہ ایک معینہ مدت کے بعد، اور بغیر کسی دباؤ کے منعقد کیے جاتے رہیں۔ حکمران گروہ کو جب اس امر کا احساس ہو کہ اُس قوم نے یہ امانت ایک خاص مدت کے لیے سونپی ہے اور اس کے گزر جانے کے بعد اسے قوم کے سامنے اپنا دفتر عمل پیش کرنا ہے تو اُس کے دل میں لازمی طور پر رائے عامہ کا احترام پیدا ہوتا ہے اور وہ کوئی کام محض حکمرانی کی تزنگ میں آکر کرنے سے گریز کرتا ہے۔ اُس کے سارے کارنامے اُس کے ذاتی نظریات اور رجحانات کے بجائے عوامی رائے کے ترجمان ہوتے ہیں اور اُس کی سرگرمیاں ذاتی مفادات کے گرد گھومنے کے بجائے اجتماعی مفادات کے لیے وقف ہو جاتی ہیں۔ جب حاکم و محکوم کے مفادات ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوں تو اُن کے تعلقات کشیدگی اور منافرت کے جذبات پر استوار ہونے کے بجائے محبت اور اخلاص کی بنیاد پر استوار ہوتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے الگ تھلک رہنے کے بجائے ایک دوسرے کے نزدیک آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حکمران طبقہ یونانی دیوتاؤں کی طرح اقتدار کے نشے میں بدمست ہو کر محلات اور الیوانوں کے اندر سنگینوں کے پھرے میں رہنا گوارا نہیں کرتا بلکہ عوام کے قریب آکر اُن کے دل کی دھڑکنوں کو سنتا ہے، اُن کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور انہیں اپنی مشکلات اور اُن کے فرائض سے آگاہ کرتا ہے

دوسری طرف عوام حکمرانوں کو اپنے اور اپنے مفادات کا دشمن سمجھنے کے بجائے انہیں اپنا حقیقی خیر خواہ اور جاں نثار خیال کرتے ہیں۔ انہیں ان کی دیانت، امانت اور اخلاص پر پورا پورا بھروسہ ہوتا ہے اور وہ اس بات کے لیے ان کے ممنون احسان ہوتے ہیں کہ انہوں نے محض قوم کی فلاح و بہبود کی خاطر یہ بارگراں اٹھایا ہے۔ اس لیے وہ حکمرانوں کی ہر آواز پر دل و جان سے لبیک کہتے ہیں، ہر قدم پر ان کی معادنت اور دستگیری کرتے ہیں اور ہر مشکل میں ان کا پورے خلوص کے ساتھ ہاتھ بٹاتے ہیں۔

جمہوریت انسانوں کی اسی آبادی میں پنپ سکتی ہے جہاں لوگوں میں اپنے حقوق و فرائض کا احساس ہو اور انہیں رائے عامہ کی بالا دستی قائم کرنے کے مواقع میسر آئیں۔ آج اگر پاکستان میں جمہوری روایات اچھی طرح پروان نہیں چڑھیں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس ملک کے باشندوں نے شرفِ انسانیت کو تیاگ دیا ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ان روایات کو پوری طرح نشوونما پانے کا موقع نہیں دیا گیا۔ اس ناکامی کی سب سے زیادہ ذمہ داری اس ملک کے حکمرانوں پر عائد ہوتی ہے۔ ان حضرات نے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ یہاں اقتدار کا سرچشمہ عوام کے بجائے نوکر شاہی طبقہ ہے اس لیے انہوں نے عوام کو اعتماد میں لینے کے بجائے جوڑ توڑ اور سازش کے ذریعہ کسی نہ کسی طرح تختِ اقتدار پر قبضہ کیا اور پھر انتظامیہ کے بل بوتے پر لوگوں پر حکومت کرنی شروع کر دی۔ ان کے اس غلط طرز عمل کا پورے ملک اور اس کے سارے طبقوں کو شدید نقصان اٹھانا پڑا ہے۔

تختِ اقتدار قوم کی قوت و طاقت کا مرکز بننے کے بجائے نہایت گھٹیا قسم کی سازشوں کا اڈا بن گیا۔ حکمرانوں کے دل سے رائے عامہ کا احترام بالکل جاتا رہا اور انہوں نے عوام کی خدمت کے بجائے ان لوگوں کی جانز و نا جانز سرپرستی شروع کی جو انہیں کسی طرح اقتدار کی

کرسی پر مستط کر سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جن ملازموں کا اصل کام ملک کو بیرونی خطرات اور اندرونی خلفشار سے بچانا تھا وہ ان سازشوں میں براہ راست شریک ہو گئے اور انہوں نے اپنے حدود سے تجاوز کر کے وہ کارہائے نمایاں انجام دینے شروع کر دیئے جو دراصل ان کے فرائض اور اختیارات سے بالکل خارج تھے۔ جو شخص یا طبقہ اپنے اصل فرائض کو چھوڑ کر اپنے ذمہ کچھ دوسرے غیر ضروری کام لے لیتا ہے وہ کسی دائرہ میں بھی کوئی مفید خدمت انجام نہیں دے سکتا۔ اس سے اس کی استعداد و کار میں کمی آ جانا بالکل ناگزیر ہے۔ چنانچہ اس ملک کی انتظامی مشینری کا بھی یہی حشر ہوا۔ وہ حضرات جن کے سپرد مختلف شعبوں کا انتظام و انصرام تھا انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو اپنے فرائض منصبی کی بجائے آوری میں صرف کرنے کے بجائے دھڑے بندیوں میں کھپاتا شروع کر دیا اور اس طرح ملک کا نظم و نسق درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ آپ اپنے گرد و پیش پر نگاہ ڈالیے اور دیکھیے کہ یہاں ایک عام شہری کی زندگی کس طرح عذاب نینی جا رہی ہے۔ جن کانڈوں کو لوگوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کا فرض سونپا گیا ہے، ان کا بیشتر وقت برسرِ اقتدار گروہ کے مفادات کی پاسبانی میں صرف ہوتا ہے اور اس لیے وہ اُن ذمہ داریوں کی طرف توجہ دینے سے قاصر ہیں جن کی بجائے آوری کے لیے انہیں عوام کے خزانے سے معاوضہ دیا جاتا ہے۔ کوئی اخبار اٹھا کر دیکھیے آپ کو سماج دشمن عناصر کی ستم رانیوں کے پسیوں واقعات ایک ہی صفحہ پر نظر آئیں گے۔ غریب اور بے سہارا عورتیں راہ چلتے اٹھالی جاتی ہیں اور پھر ان کا کہیں نام و نشان تک نہیں ملتا۔ بے گناہ لوگ دن و ہارے قتل ہو جاتے ہیں اور قاتلوں کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ بد نصیب بچے ہر روز اغوا کیے جاتے ہیں، اُن کے والدین اُن کی جدائی میں گھل گھل کر دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں، لیکن انہیں اپنے ان جگر گوشوں کا دیدار نصیب نہیں ہوتا۔ کیا ان معصوم بچیوں کو آسمان اچک لیتا ہے یا زمین نکل جاتی ہے؟ آخر ان کا کیوں کوئی کھوج نہیں ملتا؟ جو پولیس اقتدار سے اختلاف کرنے والوں کے پیچھے ہر وقت سایہ کی طرح لگی رہے اور اس معاملے میں اس کی کارکردگی کا یہ عالم ہو کہ اُن کی کوئی حرکت اس کی خوردبین نگاہوں سے

بچ نہ سکے اُس کے بارے میں یہ باور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اُڑے ہوئے گھروں کو اُن کے اغوا شدہ بچے اور بچیاں واپس دلا کر انہیں آباد نہیں کر سکتی۔ اور جو سماج دشمن عناصر اس قسم کے گھناؤنے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں انہیں کیفرِ کِردار تک پہنچانے کی ہمت نہیں رکھتی۔ وہ اگر اس معاملے میں ناکام ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ اس کام کی اہمیت اور استعداد نہیں رکھتی بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے بعض ایسے کاموں میں الجھا دیا گیا ہے جو اُس کے فرائض میں کسی حیثیت سے بھی داخل نہیں ہیں۔

نیک اور اچھے مقاصد اچھے طریقوں ہی سے حاصل ہوتے ہیں۔ جب اقتدار جوڑوڑ، سازش اور دھاندلی سے حاصل کیا جائے تو اس کے لیے بے ضمیر، اخلاق سے عاری، طالع آزما اور غنڈے لوگوں کی خدمات نہایت ضروری ہوتی ہیں۔ اقتدار کے حریس تختِ اقتدار پر فائز ہونے کے ساتھ ہی ایسے لوگوں کی تلاش شروع کر دیتے ہیں جن کا نہ کوئی ضمیر ہو اور نہ ایمان۔ جو صاحبِ اقتدار کے ہر کام پر خواہ وہ اخلاقی، دینی یا قومی نقطہ نظر سے کتنا ہی غیر مفید اور غلط ہو، تعریف و توصیف کے ڈونگرے برسوانے کے لیے تیار رہیں اور اُس کے لطف کو کسی تلخ اور ناگوار بات سے کر کرنا نہ کریں بلکہ اُسے ہر وقت یہی باور کراتے رہیں کہ حضور کی نگاہ سے زیادہ دُورس کوئی نگاہ نہیں، حضور کی فراست سے زیادہ کسی کی فراست نہیں اور حضور کے تدبیر سے زیادہ دنیا میں کسی اور کا تدبیر نہیں۔ حضورِ ملت کی کشتی کے واحد ناخدا ہیں اور اگر خدا نخواستہ حضور اس کام سے دستکش ہو گئے تو پھر اس ناؤ کو طوفانوں کی زد سے کوئی دوسرا بچانہ سکے گا۔ اس طالع آزما طبقے کی روش میں اتنی ہمواری ہوتی ہے کہ وہ ہر اُس فرد یا گروہ کو جو ہر ہر اقتدار ہو اسی قسم کے تاثرات دیتا ہے اور جو نہی وہ اس سے محروم ہوتا ہے تو اُس کی ساری برائیاں دفعتاً اُس پر آشکارا ہو جاتی ہیں اور وہ تختِ نشینوں کے ساتھ مل کر نئے فرش نشینوں کو کوستا ہے۔ خوشامدیوں کا یہ ٹولہ کسی کا وفا دار نہیں ہوتا بلکہ ہر چڑھتے سورج کی پرستش کرتا ہے۔

اس طبقے کے علاوہ دوسرا گروہ جس کی خدمات سے اقتدار کے حریص نتائج سے یکسر بے پروا ہو کر فائدہ اٹھاتے ہیں وہ غنڈوں اور سماج دشمن عناصر پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ ہر شریف معاشرے کے لیے عذاب ہوتے ہیں اور اپنی اغلاق سوز سرگرمیوں کی وجہ سے پوری سوسائٹی کو جہنم بنا دیتے ہیں۔ ملک میں اگر کوئی فرض شناس انتظامیہ کار فرما ہو تو ہر وقت انہی کی روک میں لگی رہتی ہے اور امن پسند شہریوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کو ان سے بچانی ہے۔ کوئی معقول اور شریف انسان انہیں مٹنے نہیں لگاتا۔ البتہ جب کوئی گروہ دھونس اور دھاندلی کے ذریعہ اقتدار کے تخت کو حاصل کرنے کا تہمتہ کر لے اور اُس پر مدت و راز تک بالبحیر قابض رہنے پرتل جائے تو پھر وہی بد کردار عنصر کو اپنے مقاصد کے لیے اچھی طرح استعمال کرتا ہے۔ اس کی مدد سے شریف لوگوں کو ڈرا دھمکا کر خاموش رہنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ اسی کے ذریعہ سے اقتدار کی مخالف طاقتوں کو دبایا جاتا ہے۔ اسی کے ذریعہ سے رائے عام کو غالب آنے سے روکا جاتا ہے، اسی کی وساطت سے اپنی بے پناہ طاقت و مقبولیت کے مصنوعی مظاہرے کیے جاتے ہیں، اور اسی مقصد کو آخر کار انتخابات جیتنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ عنصر اتنا بے وقوف تو نہیں ہوتا کہ دوسروں کا آلہ کار بن کر بس ان کی خدمت انجام دینے ہی پر اکتفا کر جائے۔ وہ اپنی ان خدمات جلیلہ کے عوض لازماً حکمران طبقوں سے مختلف قسم کی مراعات حاصل کرتا ہے۔ حکمرانوں کو انہیں جرائم کی کھلی چھٹی دینی پڑتی ہے۔ وہ دیدہ دیری کے ساتھ سمگانگ کرتے ہیں، چوریاں کرتے ہیں، ڈاکے مارتے ہیں، اغوا کرتے ہیں، قتل کرتے ہیں، شہریوں کی عزت و آبرو پر ہاتھ ڈالتے ہیں، اور ملک کی انتظامی مشینری ان کے خلاف حرکت میں آنے سے عاجز رہتی ہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ وہی لوگ جو انہیں اپنے عہد اقتدار میں مخالفوں کو ہراساں اور پریشان کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں، تخت اقتدار چھین جانے کے بعد خود ان کی ستم رانیوں کا تختہ مشق بنتے ہیں لیکن اس سے کوئی عبرت حاصل نہیں کرتے۔

(باقی ملاحظہ فرمائیں)

بھی شامل کتاب کیا گیا ہے جس میں علاوہ اغلاط کتاب کی تصحیح کے کچھ نوٹس بھی شامل کیے گئے ہیں۔

بقیہ اشارات،

یہ دونوں طبقے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ملک و ملت کے لیے انتہائی خطرناک ہیں۔
 ضمیمہ فروری، خود غرضی، اقتدار پرستی سیرت و کردار کے لیے سم قاتل کی خشیت رکھتی ہیں جب کسی
 فرد یا گروہ کو چھوٹے چھوٹے دنیاوی فوائد کا لالچ دے کر اپنے ایمان کو سچنے کی مشق کرائی جائے
 تو پھر یہی کمزوری اس کے اندر پوری طرت بٹریکڑ جاتی ہے اور وہ کسی اونچے منصب اور کسی
 بڑے قائدے کے لیے ایسا اوقات پوری قوم کے مفاد کو قربان کر دیتا ہے۔ اسی طرح جب
 سماج دشمن عناصر کی پشت پناہی کر کے ان سے مخالفوں کو مرعوب کرایا جائے تو پھر یہ عناصر
 بالکل بے لگام ہو کر نہ صرف عوام کے لیے پریشانی کا موجب بنتے ہیں بلکہ خود برسر اقتدار طبقوں
 کے لیے بھی وبالِ جان بن جاتے ہیں۔

ضروری احلان

۱) منصب رسالت نمبر کی چند کاپیاں دفتر میں موجود ہیں جن کو ۳/۵ روپے کی
 بجائے صرف دو روپے میں معہ خرچہ ڈاک منگوا یا جاسکتا ہے۔
 ۲) ترجمان القرآن کے پرانے پرچے از جون ۱۹۶۳ء تا اکتوبر ۱۹۶۳ء دفتر میں
 غیر مسلسل موجود ہیں۔ ۳ روپی کاپی کے حساب سے جن اصحاب کو ضرورت ہو
 منگوا سکتے ہیں۔

یہ سب ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور